تھی، چپکے سے اپنی راہ لینا چاہتی تھی۔ دعا دینے کا خبط سوار ہوا۔ اب جان گئے بچے؟ ڈرتے ڈرتے بولی: "سرکار کا اقبال بڑھے، رتبہ بڑھے نام بڑھے"

میناکشی مسکرائی: "ہاں ٹھیک ہے"

وہ آکر اپنے موٹر پر بیٹھی، حاکم ضلع کے بنگلے پر پہنچ کر اس واقعہ کی اطلاع دی اور پھر اپنی کوٹھی کو چلی گئی۔ اس وقت سے عورت مرد ایک دوسرے کے پیاسے تھے۔ دگ بجے سنگھ ریوالور لئے اس کی تاک میں پھرا کرتے تھے اور وہ بھی اپنی حفاظت کے لئے دو پہلوان ٹھاکروں کو اپنے ساتھ لئے رہتی تھی۔ اور رائے صاحب نے سکھوں کا جو سرگ (بہشت) بنایا تھا اسے اپنی ہی زندگی میں غارت ہوتے دیکھ رہے تھے۔ اب دنیا سے مایوس ہو کر ان کی روح اندر کی جانب متوجہ ہو رہی تھی۔ اب تک خواہشات سے جیتے رہنے کی تحریک ملتی رہتی تھی، اب اُدھر کا راستہ بند ہو جانے پر ان کا دل خود بخود عبادت کی طرف جھکا جس میں خواہشات سے کہیں زیادہ سچائی تھی۔ جس نئی جائداد کے بھروسے قرض لیا تھا وہ جائداد ادائی کے بغیر ہی ہاتھ سے نکل گئی اور وہ بوجھ سر پر لدا ہوا تھا۔ ہوم ممبری سے ضرور اچھی رقم ملتی تھی مگر وہ سب کی سب اس عہدے کا وقار قائم رکھنے ہی میں صرف ہو جاتی تھی۔ اور رائے صاحب کو اپنی شاہانہ شان و شوکت نباہنے کے لئے وہی اسامیوں پر اضافہ اور بے دخلی کرنا اور ان سے نذرانہ لینا پڑتا تھا جس سے انھیں دلی نفرت تھی۔ وہ رعایا کو تکلیف نہ دینا چاہتے تھے۔ ان کی حالت پر انھیں رحم آتا تھا، مگر اپنی ضروریات سے مجبور تھے مگر موہ انھیں چھوڑتا نہ تھا اور اس کش مکش میں بھی انھیں سکون نہ ملتا تھا۔ وہ موہ (رغبت) کو چھوڑنا چاہتے تھے مگر موہ انھیں چھوڑتا نہ تھا اور اس کش مکش میں پڑ کر انھیں ذلت، افسوس اور اضطراب سے چھٹکارا نہ ملتا تھا۔ اور جب دل میں سکون نہیں تو جسم کیسے ٹھیک رہتا۔ صحت قائم

رکھنے کی پوری تدبیر کرنے پر بھی ایک نہ ایک روگ لگا رہتا تھا۔ رسوئی میں سب ہی طرح کے لذیذ کھانے پکتے تھے مگر ان کی تقدیر میں تو وہی مونگ کی دال اور پھلکے تھے۔ اپنے اور بھائیوں کو دیکھتے تھے جو ان سے بھی زیادہ مقروض، پست اور مغموم تھے، جن کے عیش و عشرت اور شان و شوکت میں کوئی کمی نہ تھی۔ مگر ایسی بے حیائی کرنا ان کے امکان سے بعید تھا۔ ان کی روح کے اونچے سنسکاروں کی بربادی نہ ہوئی تھی۔ ظلم، مکاری، بے عزتی اور تکلیف رسانی کو وہ تعلقہ داری کی زینت اور شان و شوکت کا نام دے کر اپنے دل کو مطمئن نہ کر سکتے تھے، یہی اُن کی سب سے بڑی شکست تھی۔

مرزا خورشید نے اسپتال سے نکل کر ایک نیا کام شروع کر دیا تھا بے فکری سے بیٹھے رہنا ان کے مزاج میں داخل نہ تھا۔ یہ کام کیا تھا؟ شہری بیسواؤں کی ایک ناٹک منڈلی بنانا۔ فارغ البالی کے زمانے میں انھوں نے خوب عیاشی کی تھی اور ان دنوں اسپتال کے تخلئے میں زخموں کی تکلیف ہوتی تھی۔ اس وقت اگر ان میں سمجھ ہوتی تو وہ لوگوں کی کتنی بھلائی کر سکتے تھے، کتنوں کے رنج وافلاس کا بوجھ ہلکا کر سکتے تھے، مگر وہ دولت انھوں نے عیاشی میں اڑائی یہ کوئی نئی بات نہیں کہ مصیبت ہی میں ہماری روح بیدار ہوتی ہے۔ بڑھاپے میں کون اپنی جوانی کی غلطیوں پر افسوس نہیں کرتا؟ کاش وہ وقت عقل و طاقت کے حاصل کرنے میں لگایا جاتا، نیک اعمال کا خزانہ بھر لیا جاتا، تو آج دل کو کتنی تسکین ملتی! وہیں ان کو اس امر کا افسوسناک تجربہ ہوا کہ دنیا میں کوئی اپنا نہیں کوئی ان کی موت پر دو آنسو بہانے والا نہیں۔ انھیں رہ رہ کر زندگی کا ایک پرانا واقعہ یاد آتا تھا۔ بصرہ کے ایک گاؤں میں جب وہ کیمپ میں ملیریا سے بیمار پڑے تھے اس وقت ایک دیہاتی لڑکی نے ان کی تیمارداری کتنی جانفشانی سے کی تھی صحت ہو جانے پر جب انھوں نے روپئے اور زیوروں سے اس کے احسانوں کا بدلہ چکانا چاہا تو اس نے کس طرح آنکھوں میں آنسو بھر کر سر نیچا کر لیا تھا اور ان کا تحائف کے لینے سے انکار کر دیا تھا۔ ان دائیوں کی خدمت میں ضبط ہے قاعدہ ہے، سچائی ہے، مگر وہ محبت کہاں، وہ انہماک کہاں، جو اس کی بے غرض

اور طفلانہ خدمات میں تھا؟ وہ محبت کی مورت ان کے دل سے کب کی مٹ چکی تھی۔ د
اس سے پھر آنے کا وعدہ کر کے کبھی اس کے پاس نہ گئے۔ عیش و عشرت کی مصروفیتو
میں کبھی اس کی یاد ہی نہ آئی۔ آئی بھی تو اس میں صرف رحم تھا، محبت نہ تھی، معلوم
نہیں اس لڑکی پر کیا گذری، مگر آج کل اس کا وہ انکسار، سکون اور سادگی سے
بھرا ہوا چہرہ بار بار ان کی آنکھوں کے سامنے پھرا کرتا تھا۔ کاش اس سے شادی
کرلی ہوتی تو آج زندگی کتنی پُرکیف ہوتی۔ اور اس کے متعلق اس نامنصفانہ
سلوک کی دکھ بھری یاد نے کل نسوانی طبقے کو ان کی خدمت اور ہمدردی کا مستحق
بنا دیا تھا۔ جب تک ندی بڑھاؤ پر تھی، گدلے، تیز اور جھاگ دار بہاؤ میں روشنی
کی شعاعیں بکھر کر رہ جاتی تھیں۔ اب پانی برابر اور برقرار ہو گیا تھا اور کرنیں
اس کی تہ تک پہنچ رہی تھیں۔

مرزا صاحب بسنت رت کی اس ٹھنڈی شام میں اپنے جھونپڑے کے برآمدے
میں دو طوائفوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے بات چیت کر رہے تھے کہ مسٹر مہتا آپہنچے
مرزا نے بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا اور بولے "میں تو آپ کی خاطر داری کا سامان
لئے ہوئے آپ کی راہ دیکھ رہا ہوں۔"

دونوں بیوائیں مسکرائیں۔ مہتا کٹ گئے۔

مرزا نے دونوں کو وہاں سے چلے جانے کا اشارہ اور مہتا کو مسند پر
بٹھاتے ہوئے بولے "میں تو خود آپ کے پاس آنے والا تھا۔ مجھے ایسا
معلوم ہو رہا ہے کہ میں جو کام کرنے جا رہا ہوں وہ آپ کی مدد کے بغیر پورا نہ
ہوگا۔ آپ صرف میری پشت پر ہاتھ رکھے رہیئے اور للکارتے جایئے، ہاں
مرزا، بڑھا چل پٹھے!"

مہتا نے ہنس کر کہا "آپ جس کام میں ہاتھ لگائیں گے اس میں ہم جیسے

بی کیڑوں کی امداد کی ضرورت نہ ہوگی۔ آپ کی عمر مجھ سے زیادہ ہے، دنیا بھی آپ نے خوب دیکھی ہے اور چھوٹے سے چھوٹے آدمیوں پر اپنا اثر ڈالنے کی جو طاقت آپ میں ہے وہ مجھ میں ہوتی تو میں نے خدا جانے کیا کچھ کر دیا ہوتا۔"

مرزا صاحب نے مختصر الفاظ میں اپنی نئی تجویز بیان کی۔ ان کی رائے تھی کہ حسن کے بازار میں وہی عورتیں آتی ہیں جنھیں یا تو اپنے گھر میں کسی وجہ سے باعزت قیام نہیں ملتا یا جو مالی تکلیفوں سے مجبور ہو جاتی ہیں اور اگر یہ دونوں مسئلے حل کر دیئے جائیں تو بہت کم عورتیں اس طرح ذلیل و خوار ہوں۔

مہتا نے بھی دوسرے سمجھ دار لوگوں کی طرح اس مسئلہ پر کافی غور کیا تھا اور ان کا خیال تھا کہ زیادہ تر فطرتی رجحان اور عیش و عشرت کا شوق ہی عورتوں کو اس طرف کھینچتا ہے۔ اسی بات پر دونوں میں بحث چھڑ گئی۔ دونوں اپنی اپنی بات پر اڑ گئے۔

مہتا نے مٹھی باندھ کر ہوا میں نکتے ہوئے کہا "آپ نے اس مسئلے پر ٹھنڈے دل سے غور نہیں کیا، مرزا صاحب! رزق کے لئے اور بہت سے ذرائع ہیں مگر عیش و آرام کی بھوک روٹیوں سے نہیں مٹتی۔ اس کے لئے دنیا کی بڑھیا بڑھیا چیزیں چاہئیں۔ جب تک سوشل نظام اوپر سے نیچے تک بدل نہ ڈالا جائے، اس طرح کی منڈلی سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔"

مرزا نے مونچھیں کھڑی کیں "اور میں کہتا ہوں کہ یہ محض رزق کا سوال ہے، ہاں یہ سوال سب ہی لوگوں کے لئے یکساں نہیں ہے۔ مزدور کے لئے وہ صرف آٹا دال اور ایک جھونپڑی کا سوال ہے۔ وکیل کے لئے وہ ایک موٹر، بنگلہ اور خدمت گاروں کا سوال ہے آدمی صرف روٹی نہیں چاہتا اور بھی بہت سی چیزیں چاہتا ہے۔ اگر عورتوں کے سامنے بھی وہ سوال انواع

انسام کی صورتوں میں آتا ہے تو ان کا کیا قصور ہے ؟"

ڈاکٹر مہتا اگر ذرا غور کرتے تو انھیں معلوم ہوتا کہ ان میں اور مرزا میں کوئی فرق نہیں ؛ صرف الفاظ کا ردوبدل ہے ، مگر بحث کی گرماگرمی میں غور کرنے کے لئے صبر کہاں ؟ گرم ہو کر بولے "معاف کیجئے مرزا صاحب ، جب تک دنیا میں دولت والے رہیں گے ، بیوائیں بھی رہیں گی ، آپ کی منڈلی اگر کامیاب بھی ہو جائے ، حالانکہ مجھے اس میں بہت شک ہے ، تو آپ دس پانچ عورتوں سے زیادہ اس میں کبھی نہ لے سکیں گے اور وہ بھی تھوڑے دنوں کے لئے ۔ سب ہی عورتوں میں ناٹک کرنے کی اہلیت نہیں ہوتی ، اسی طرح جیسے سب ہی لوگ شاعر نہیں ہو سکتے ، اور یہ بھی مان لیں کہ یہ عورتیں آپ کی منڈلی میں مستقل طور پر ٹھہر جائینگی تو بھی بازار میں ان کی جگہ خالی نہ رہے گی ۔ جڑ پر جب تک کلہاڑے نہ چلیں گے پتیاں توڑنے سے کوئی نتیجہ نہیں ۔ دولت والوں میں کبھی کبھی ایسے لوگ نکل آتے ہیں جو سب کچھ چھوڑ کر خدا کی راہ میں جا بیٹھتے ہیں ، مگر دولت کا راج بدستور قائم ہے ۔ اس میں ذرا بھی زوال نہیں آنے پایا ۔

مرزا کو مہتا کی ہٹ دھرمی پر رنج ہوا ۔ اتنا پڑھا لکھا سمجھدار آدمی ایسی باتیں کرے ! سوشل نظام کیا آسانی سے بدل جائے گا ؟ وہ تو صدیوں کا معاملہ ہے ۔ تب تک کیا یہ اندھیر ہونے دیا جائے ؟ اس کی روک تھام نہ کی جائے اور ان غریب عورتوں کو مردوں کی ہوس کا شکار ہونے دیا جائے ؟ کیوں نہ شیر کو پنجڑے میں بند کر دیا جائے کہ وہ دانت اور ناخون رکھتے ہوئے بھی کسی کو نقصان نہ پہنچا سکے ؟ کیا اس وقت تک خاموش بیٹھا رہا جائے ۔ جب تک شیر اہنسا کا برت نہ لے لے ؟ دولت والے اور جس طرح چاہیں اپنی دولت اڑائیں مرزا کو غم نہیں ۔ شراب میں ڈوب جائیں ، موٹروں کی مالا گلے میں ڈال لیں ، قلعے

بنوائیں، دھرم شالے اور مسجدیں کھڑی کریں، مرزا کو کوئی پروا نہیں۔ ہاں عورتوں کی زندگی نہ خراب کریں۔ اسے مرزا نہیں دیکھ سکتے۔ وہ حسن کے بازار کو ایسا سنسان کردیں گے کہ دولت مندوں کی اشرفیوں پر کوئی تھوکنے والا بھی نہ ملے۔ کیا جن دنوں شراب کی دوکانوں پر پکٹنگ ہوتی تھی۔ بڑے بڑے شرابی پانی پی پی کر دل کی آگ نہیں بجھا لیتے تھے؟

مہتا نے مرزا کی بیوقوفی پر ہنس کر کہا "آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ دنیا میں ایسے ملک بھی ہیں جہاں کسبیاں نہیں ہیں، مگر امیروں کی دولت وہاں بھی اپنی دلچسپیوں کا سامان پیدا کر ہی لیتی ہے۔"

مرزا بھی مہتا کی نادانی پر ہنسے "جانتا ہوں مہربان، جانتا ہوں! آپ کی دعا سے دنیا دیکھ چکا ہوں، مگر یہ ہندوستان ہے، یورپ نہیں ہے۔"

"انسانی سرشت ساری دنیا میں ایک سی ہے۔"

"مگر یہ معلوم بھی رہے کہ ہر قوم میں ایک ایسی چیز ہوتی ہے جسے اس کی روح کہہ سکتے ہیں، اور عصمت ہندوستانی تہذیب کی روح ہے۔"

"اپنے منہ میاں مٹھو بن لیجئے۔"

دولت کی آپ اتنی بُرائی کرتے ہیں پھر بھی کھنّا کی حمایت کرتے نہیں تھکتے نہ کہئے گا!"

مہتا کی تیزی رخصت ہوگئی، انکسار سے بولے "میں نے کھنّا کی حمایت اس وقت کی ہے جب وہ دولت کے پنجے سے چھوٹ گئے ہیں، اور آج کل ان کی حالت آپ دیکھیں تو آپ کو رحم آئے گا۔ اور میں کیا حمایت کروں گا جسے اپنی کتابوں اور لائبریری سے فرصت نہیں؟ زیادہ سے زیادہ خشک ہمدردی ہی تو کر سکتا ہوں۔ حمایت کی ہے مس ماتنی نے کہ کھنّا کو بچا لیا۔ انسان کی گہرائیوں

میں ایثار کی کتنی طاقت چھپی ہوتی ہے۔ اس کا مجھے اب تک تجربہ نہ ہوا تھا۔ آپ بھی ایک دن کھنّا سے مل آیئے۔ طبیعت خوش ہو جائے گی۔ اس وقت اسے جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ ہمدردی ہے۔"

مرزا نے جیسے اپنی مرضی کے خلاف کہا "آپ کہتے ہیں تو جاؤں گا۔ آپ کے ساتھ جہنم میں بھی عذر نہیں۔ مگر مس مالتی سے تو آپ کی شادی ہونے والی تھی بڑی گرم خبر تھی۔"

مہتا نے جھینپتے ہوئے کہا: "ریاضت کر رہا ہوں، دیکھئے ثمرہ کب ملے۔"

"اجی وہ تو آپ پر مرتی تھی۔"

"مجھے بھی وہم ہوا تھا، مگر جب میں نے ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑنا چاہا تو دیکھا کہ وہ آسمان میں جا بیٹھی ہے۔ اُس بلندی تک تو میں کیا پہنچوں گا، ہاں اسی سے التجا کر رہا ہوں کہ نیچے آ جائے۔ آج کل تو وہ مجھ سے بولتی بھی نہیں۔"

یہ کہتے ہوئے مہتا زور سے ایک روتی ہوئی ہنسی ہنسے اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

مرزا نے پوچھا "اب پھر کب ملاقات ہوگی؟"

"اب کے آپ کو تکلیف کرنی پڑے گی۔ کھنّا کے پاس جائے گا ضرور!"

"جاؤں گا۔"

مرزا نے کھڑکی سے مہتا کو جاتے دیکھا۔ رفتار میں وہ تیزی نہ تھی، جیسے کسی فکر میں ڈوبے ہوئے ہوں۔

ڈاکٹر مہتا ممتحن ہو گئے ہیں۔ مالتی سے دور دور رہ کر انھیں یہ شک ہونے لگا ہے کہ کہیں اسے کھو نہ بیٹھیں۔ کئی مہینے سے مالتی ان کے پاس نہ آئی تھی اور جب وہ بے قرار ہو کر اس کے گھر گئے تو ملاقات نہ ہوئی۔ جن دنوں رُدر پال اور سروج کا عشقیہ واقعہ ہو رہا تھا تو مالتی ان کی صلاح لینے عموماً روزانہ دو ایک بار آتی تھی، مگر جب سے دونوں انگلستان چلے گئے تھے، اس کا آنا جانا بند ہو گیا تھا گھر پر بھی مشکل سے ملتی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان سے بچتی ہے، گویا ان کی طرف سے اپنے دل کو جبراً ہٹا لینا چاہتی ہے۔ جس کتاب کو وہ آج کل لکھ رہے تھے وہ آگے بڑھنے سے انکار کر رہی تھی گویا ان کی توجہ مفقود ہو گئی ہو۔ خانہ داری کے انتظام میں تو وہ کبھی بڑے ہوشیار نہ تھے۔ فی الجملہ ایک ہزار روپئے سے زیادہ مہینے میں کما لیتے تھے مگر بچت ایک کوڑی کی بھی نہ ہوتی تھی۔ روٹی دال کھانے کے سوا اور ان کے ہاتھ کچھ نہ لگتا تھا۔ تکلف کا اگر کوئی سامان تھا تو وہ ان کا موٹر تھا جسے وہ خود چلاتے تھے۔ کچھ روپئے کتابوں میں اڑ جاتے تھے، کچھ چندوں میں، کچھ غریب طلباء کی امداد میں اور کچھ باغ کی آرائش میں جس سے انھیں عشق سا تھا۔ طرح طرح کے پودے اور نباتاتی نمونے بدیس سے مہنگے داموں منگانا اور ان کی داشت کرنا، یہی ان کا چھوڑا پن تھا۔ مگر ادھر کئی مہینے سے اس باغیچے کی طرف سے بھی وہ کچھ بیزار سے ہو رہے تھے اور گھر کا انتظام بھی ابتر ہو گیا تھا۔ کھاتے دو پھلکے اور خرچ ہوتا ایک سو سے زیادہ۔ اچکن پرانی ہو گئی تھی، مگر اسی میں انھوں نے کڑاکے کا جاڑا کاٹ دیا، نئی اچکن

سلانے کی توفیق نہ ہوئی۔ کبھی کبھی بلا گھی کی دال کھا کر اٹھ آنا پڑتا۔ کب گھی کا کنستر منگایا تھا، اس کی انھیں یاد ہی نہ تھی، اور مہراج سے پوچھیں بھی تو کیسے ؟ وہ سمجھے گا نہیں کہ اس پر بے اعتباری ہو رہی ہے ؟ آخر ایک روز جب تین مرتبہ کی مایوسیوں کے بعد چوتھی مرتبہ مالتی سے ملاقات ہوئی اور اس نے ان کی یہ حالت دیکھی تو اس سے نہ رہا گیا۔ بولی: "تم کیا اب کے جاڑا یوں ہی کاٹ دو گے؟ یہ اچکن پہنتے ہوئے شرم بھی نہیں آتی ؟"

مالتی ان کی بیوی نہ ہو کر بھی ان کے اتنے پاس تھی کہ یہ سوال اس نے اسی معمولی انداز سے کیا جس طرح وہ اپنے کسی یگانے سے کرتی۔

مہتا نے بلا شرماتے ہوئے کہا: "کیا کروں مالتی، پیسہ تو بچتا ہی نہیں۔"

مالتی کو تعجب ہوا: "تم ایک ہزار سے زیادہ کماتے ہو اور تمھارے پاس اپنے کپڑے بنوانے کو بھی پیسے نہیں ؟ میری آمدنی کبھی چار سو سے زیادہ نہ تھی مگر میں اسی میں ساری گرستی چلاتی ہوں اور کچھ بچا بھی لیتی ہوں۔ آخر تم کیا کر ڈالتے ہو؟"

"میں ایک پیسہ بھی فالتو نہیں خرچ کرتا۔ مجھے کوئی ایسا شوق بھی تو نہیں ہے۔"

"اچھا تو مجھ سے روپیہ لے جاؤ اور دو اچکنیں بنوا لو۔"

مہتا نے خجالت سے کہا: "اب کے بنوا لوں گا، سچ کہتا ہوں۔"

"اب آپ ... آئیں تو آدمی بن کر آئیں۔"

"یہ تو بڑی کڑی شرط ہے۔"

"کڑی سہی۔ تم جیسوں کے ساتھ کڑائی کئے بغیر کام بھی تو نہیں چلتا۔"

گر وہاں تو صندوق خالی تھا اور پیسے کے بغیر کسی دوکان پر جانے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ مالتی کے گھر جائیں کس منہ سے؟ دل میں تڑپ کر رہ جاتے تھے۔ ایک دن ایک نئی مصیبت آپڑی۔ ادھر کئی مہینے سے مکان کا کرایہ نہیں دیا تھا۔ پچھتر روپئے ماہوار بڑھتے جاتے تھے۔ مالک مکان نے جب کئی تقاضوں کے بعد بھی روپئے نہ وصول کر پائے تو نوٹس دے دیا۔ مگر نوٹس روپیہ بنانے کی کوئی مشین تو ہے نہیں۔ تاریخ نکل گئی اور روپئے نہ پہنچے۔ تب مالک مکان نے مجبور ہو کر نالش کر دی۔ وہ جانتا تھا کہ مہتا جی بڑے شریف اور فیاض آدمی ہیں مگر اس سے زیادہ بھلمنسی وہ کیا کرتا کہ چھ ماہ تک صبر کئے بیٹھا رہا؟ مہتا نے کوئی پیروی نہ کی اور ایک طرفہ ڈگری ہو گئی۔ مالک نے فوراً ڈگری جاری کرائی اور فرق امین مہتا صاحب کے پاس پہلی اطلاع دینے آیا، کیونکہ اس کا لڑکا یونیورسٹی میں پڑھتا تھا اور اسے مہتا صاحب کچھ وظیفہ بھی دیتے تھے۔ اتفاقاً اس وقت مالتی بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ بولی: "کیسی قرقی ہے کس بات کی؟"

امین نے کہا: "وہی کرایہ کی ڈگری جو ہوئی تھی۔ میں نے کہا کہ حضور کو اطلاع دے دوں۔ چار پانچ سو کا معاملہ ہے، کون سی بڑی رقم ہے؟ دس دن میں بھی روپئے دے دیجئے تو کوئی حرج نہیں۔ میں مہاجنوں کو دس دن تک الجھائے رکھوں گا۔"

جب امین چلا گیا تو مالتی نے حقارت کے لہجے میں پوچھا: "تو اب یہاں تک نوبت پہنچ گئی! مجھے تعجب ہوتا ہے کہ تم اتنی موٹی موٹی کتابیں کیسے لکھتے ہو۔ مکان کا کرایہ چھ چھ ماہ سے باقی پڑا ہے اور تمہیں خبر نہیں؟"

مہتا شرم سے سر جھکا کر بولے: "خبر کیوں نہیں ہے، لیکن روپئے بچتے ہی نہیں۔ میں ایک پیسہ بھی فضول صرف نہیں کرتا۔"

"کوئی حساب کتاب بھی ہے؟"

"حساب کیوں نہیں لکھتا۔ جو کچھ پاتا ہوں وہ سب درج کر لیتا ہوں ورنہ انکم ٹیکس والے زندہ نہ چھوڑیں۔"

"جو کچھ خرچ کرتے ہو وہ؟"

"اس کا تو کوئی حساب نہیں رکھتا۔"

"کیوں؟"

"کون لکھے؟ بوجھ سا لگتا ہے۔"

"اور یہ پونجے کیسے لکھ ڈالتے ہو؟"

"اس میں تو زیادہ کچھ نہیں کرنا پڑتا۔ قلم لے کر بیٹھ جاتا ہوں اور لکھنے لگتا ہوں۔ ہر وقت خرچ کا کھاتا کھول کر تو نہیں بیٹھتا۔"

"تو یہ روپئے کیسے ادا کرو گے؟"

"کسی سے قرض لے لوں گا، تمہارے پاس ہوں تو تم ہی دے دو۔"

میں تو ایک ہی شرط پر دے سکتی ہوں کہ تمہاری آمدنی سب میرے ہاتھ آئے اور خرچ بھی میرے ہی ہاتھ ہو۔"

مہتا خوش ہو کر بولے: "واہ! اگر یہ ذمہ داری لے لو تو کیا کہنا! موسلوں سے ڈھول بجاؤں!"

مالتی نے ڈگری کے روپئے دے دیئے اور دوسرے ہی روز مہتا کو بنگلہ خالی کر دینے پر مجبور کیا۔ اپنے بنگلے میں اس نے انھیں دو بڑے بڑے کمرے دے دیئے۔ ان کے کھانے وغیرہ کا بندوبست بھی اپنے ہی گھر میں کر دیا۔ مہتا کے پاس اور سامان تو زیادہ نہ تھا مگر کتابیں کئی گاڑی تھیں ان کے دونوں کمرے کتابوں سے بھر گئے۔ باغیچہ چھوڑنے کا انھیں ضرور

قلق ہوا لیکن مالتی نے اپنا پورا احاطہ ان کے لئے چھوڑ دیا تھا کہ جو پھول پودے چاہیں، لگائیں۔

مہتا تو بے فکر ہو گئے، لیکن مالتی کو ان کی اور خرچ کے ٹھیک کرنے میں بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس نے دیکھا کہ آمدنی تو ہزار سے زیادہ ہے مگر وہ ساری کی ساری خیفہ خیرات میں صرف ہو جاتی ہے۔ بیس بچیں لڑکے انھیں سے وظیفہ پاکر اسکول میں پڑھ رہے تھے۔ بیواؤں کی تعداد بھی اس سے کم نہ تھی۔ کس خرچ میں کمی کرے اسے یہ نہ سوجھتا تھا۔ سارا الزام اسی کے سر منڈھا جائے گا۔ ساری بدنامی اسی کے حصے میں آئے گی۔ کبھی مہتا پر جھنجھلاتی، کبھی اپنے اوپر، کبھی سائلوں کے اوپر جو ایک سادہ اور سخی انسان پر اپنا بار رکھتے ہوئے ذرا بھی نہ شرماتے تھے۔ یہ دیکھ کر اور بھی جھنجھلاہٹ ہوتی تھی کہ ان خیرات لینے والوں میں کچھ تو اس کے مستحق نہ تھے ایک روز مہتا کو آڑے ہاتھوں لیا۔

مہتا نے اس کا اعتراض سُن کر بے فکری سے کہا: تمھیں اختیار ہے کہ جسے چاہے دو اور جسے چاہے نہ دو۔ مجھ سے پوچھنے کی کوئی ضرورت نہیں البتہ جواب بھی تم ہی کو دینا پڑے گا۔"

مالتی نے چڑھ کر کہا: "ہاں، اور کیا؟ نیک نامی تم لو اور بدنامی میری ہو۔ میں نہیں سمجھتی کہ تم کس دلیل سے اس خیرات کی حمایت کر سکتے ہو انسانوں کو اس رواج نے جتنا کاہل اور مفت خور بنایا ہے اور اس کی خودداری کو جتنا دھکا پہنچایا ہے، اتنا بے انصافی نے بھی نہ کیا ہوگا، بلکہ میرے خیال سے بے انصافی نے انسانوں میں انقلابی جذبہ پیدا کر کے سماج کو بڑا نفع پہنچایا ہے۔"

مہتا نے تسلیم کیا "میرا بھی یہی خیال ہے"

"تمہارا یہ خیال نہیں ہے"

"نہیں مالتی، میں سچ کہتا ہوں"

"تو خیال اور عمل میں اتنا فرق کیوں؟"

مالتی نے تیرے مہینے بہتوں کو مایوس کیا۔ کسی کو صاف جواب دیا کسی سے مجبوری جتائی اور کسی کی تضحیک کی۔

مہتا صاحب کا بجٹ تو رفتہ رفتہ ٹھیک ہوگیا۔ مگر اس سے انھیں ایک طرح کا رنج ہوا۔ مالتی نے جب تیسرے مہینے میں تین سو کی بچت دکھائی تب وہ اس سے کچھ بولے تو نہیں مگر ان کی نظر میں اس کی عظمت کچھ کم ضرور ہوگئی۔ عورت میں دان اور تیاگ ہونا چاہیے۔ یہی اس کی سب سے بڑی پونجی ہے۔ اس کی بنیاد پر سوسائٹی کا محل کھڑا ہوا ہے۔ تجارتی عقل کو وہ ضروری برائی ہی سمجھتے تھے۔

جب مہتا کی اچکنیں بن کر آئیں اور نئی گھڑی بھی آئی تو وہ شرم کے مارے کئی دن باہر نہ نکلے۔ خود آرائی سے بڑا ان کی نظر میں دوسرا گناہ نہ تھا۔

مگر راز کی بات یہ تھی کہ مالتی ان کو توحیابی شکنجے میں کس کر رکھنا چاہتی تھی ان کی مالی خیرات کا دروازہ بند کر دینا چاہتی تھی اور خود ذاتی ایثار میں اپنے وقت اور اپنی خیر اندیشی کو دونوں ہاتھوں سے لٹاتی تھی، امیروں کے گھر تو وہ بلا فیس لئے نہ جاتی تھی، مگر غریبوں کو مفت دیکھتی تھی اور مفت دوا بھی دیتی تھی۔ دونوں میں فرق صرف اتنا ہی تھا کہ مالتی گھر کی بھی تھی اور باہر کی بھی جبکہ مہتا صرف باہر کے تھے۔ گھر اُن کے لئے نہ تھا۔ اپنے کو دونوں ٹٹا دینا

چاہتے تھے۔ مہتا کا راستہ صاف تھا۔ ان پر ذاتی ذمہ داری کے سوا اور کوئی بندش نہ تھی۔ مالتی کا راستہ مشکل تھا۔ اس پر ذمہ داری تھی اور بندش تھی جسے وہ نہ توڑ سکتی تھی اور نہ توڑنا چاہتی تھی۔ اس بندش ہی میں اسے زندگی کی تحریک ملتی تھی اسے اب مہتا کو پاس دیکھ کر یہ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کھلے جنگل میں گھومنے والے جیو کو پنجڑے میں بند نہیں کر سکتی، اور بند کر دے گی، تو وہ کاٹنے اور نوچنے دوڑے گا۔ پنجرے میں سب طرح کا آرام ملنے پر بھی اس کا دل ہمیشہ جنگل کے لئے بے قرار رہے گا۔ مہتا کے لئے گھر کی دنیا ایک اجنبی دنیا تھی۔ جس کے رسم و رواج سے وہ ناآشنا تھے۔

انھوں نے دنیا کو باہر سے دیکھا تھا۔ اور اُسے مکر و فریب ہی سے معمور سمجھتے تھے۔ جدھر دیکھتے تھے۔ ادھر ہی برائیاں نظر آتی تھیں۔ مگر سماج میں جب گہرائی تک جا کر دیکھا تو انھیں معلوم ہوا کہ ان برائیوں کے نیچے ایثار بھی ہے محبت بھی ہے، اور اس شک و شبہ کی حالت میں جب مالتی کا تاریکی سے نکلتا ہوا دیوی کا روپ انھیں نظر آیا تب وہ اس کی طرف عجلت اور بے صبری کے ساتھ دوڑ پڑے۔ یہ خیال نہ رہا کہ یہ انتہائی رغبت ہی تباہی کی جڑ ہے۔ محبت جیسی بے مروت شے کیا خوف سے باندھ کر رکھی جا سکتی ہے وہ تو پورا اعتبار چاہتی ہے، پوری آزادی چاہتی ہے اور پوری ذمہ داری چاہتی ہے۔ اس کے نشو و نما کی طاقت اس کے اندر ہے۔ اسے روشنی اور فضا ملنی چاہیئے۔ وہ کوئی دیوار نہیں ہے جس پر اوپر سے اینٹیں رکھی جاتی ہیں۔ اس میں تو جان ہے، ارتقا ہے، اور پھیلنے کی بے حد حکمت ہے۔

جب سے مہتا اس بنگلے میں آئے ہیں، انھیں مالتی سے دن میں کئی

بار ملنے کا موقع ملتا ہے۔ ان کے دوست سمجھتے ہیں کہ یہ ان کے بیاہ کی تیاری ہے اور صرف رسم ادائی کی دیر ہے۔ مہتا بھی یہی خواب دیکھتے ہیں۔ اگر مالتی نے انھیں سدا کے لئے ٹھکرا دیا ہوتا تو کیوں ان سے اتنی محبت رکھتی؟ شاید وہ انھیں سوچنے کا موقع دے رہی ہے۔ اور وہ خوب سوچ کر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مالتی کے بغیر وہ نصف ہیں اور وہی انھیں تکمیل کی طرف لے جا سکتی ہے۔ باہر سے وہ رنگین مزاج ہے۔ مگر اندر سے وہی رجحان طاقت کا مرکز ہے۔ حالات تبدیل ہو گئے ہیں۔ پہلے مالتی پیاسی تھی اور اب مہتا پیاس سے تڑپ رہے ہیں۔ اور ایک مرتبہ جواب پا جانے کے بعد انھیں اس مسئلہ پر مالتی سے کچھ کہنے کی ہمت نہیں پڑتی، اگرچہ ان کے دل میں اب شک کا نام بھی نہیں رہا۔ مالتی کو قریب سے دیکھ کر ان کی کشش بڑھتی ہی جاتی ہے۔ دور سے کتاب کے جو حروف ملے جلے سے لگتے تھے اب قریب سے وہ صاف ہو گئے۔ ان میں مطلب ہے، اور پیغام ہے!

ادھر مالتی نے باغ میں مالی کا کام کرنے کے لئے گوبر کو رکھ لیا تھا ایک روز وہ کسی مریض کو دیکھ کر آ رہی تھی کہ راستہ میں پٹرول ختم ہو گیا۔ وہ خود موٹر چلا رہی تھی۔ فکر ہوئی کہ پٹرول کیسے آئے۔ رات کے نو بج گئے تھے اور ماگھ کی ٹھنڈ پڑ رہی تھی۔ سڑکوں پر سناٹا ہو گیا تھا۔ کوئی ایسا آدمی نظر نہ آتا تھا جو موٹر کو دھکیل کر پٹرول کی دوکان تک لے جائے۔ بار بار نوکر پر جھنجھلا رہی تھی: "حرام خور کہیں کا! بے خبر پڑا رہتا ہے!"

اتفاقاً گوبر ادھر سے آ نکلا۔ مالتی کو کھڑے دیکھ کر اس نے سب سمجھ لیا اور گاڑی کو دو فرلانگ دھکیل کر پٹرول کی دوکان تک لایا۔

مالتی نے خوش ہو کر پوچھا: "نوکری کرو گے؟"

گوبر نے شکریے کے ساتھ منظور کیا۔ پندرہ روپئے تنخواہ طے ہوئی۔ مالی کا کام اسے پسند تھا۔ یہی کام اس نے کیا تھا اور اس میں مشاق تھا۔ مل کی مزدوری میں اجرت زیادہ ملتی تھی مگر اس میں اس کو الجھن ہوتی تھی۔

دوسرے دن سے گوبر نے مالتی کے یہاں کام کرنا شروع کر دیا۔ اسے رہنے کو ایک کوٹھری بھی مل گئی۔ جھنیا بھی آ گئی۔ مالتی باغ میں آتی تو اسے جھنیا کا بچہ دھول مٹی میں کھیلتا ملتا۔ ایک دن مالتی نے اسے مٹھائی دے دی۔ بچہ اس دن سے مانوس ہو گیا۔ اسے دیکھتے ہی اس کے پیچھے لگ جاتا اور جب تک مٹھائی نہ لے لیتا، پیچھا نہ چھوڑتا۔

ایک دن مالتی باغ میں آئی تو بچہ نہ دکھائی دیا۔ جھنیا سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ بچے کو بخار آ گیا ہے۔ مالتی نے گھبرا کر کہا "بخار آ گیا تو میرے پاس کیوں نہیں لائی؟ چل، دیکھوں۔"

بچہ کھٹولے پر بخار میں غافل پڑا تھا۔ کھپریل کی کوٹھری میں اتنی نمی، اتنی تاریکی اور ان جاڑے کے دنوں میں بھی مچھروں کی اتنی کثرت تھی کہ مالتی ایک منٹ بھی وہاں نہ ٹھہر سکی۔ فوراً آ کر تھرمامیٹر لیا اور پھر جا کر دیکھا تو بخار ایک سو چار تھا۔ مالتی کو اندیشہ ہوا کہ کہیں چیچک نہ ہو۔ بچے کے ابھی تک ٹیکہ نہ لگا تھا۔ اور اگر اس تم کوٹھری میں رہا تو اندیشہ تھا کہ بخار نہ بڑھ جائے۔

دفعتاً بچے نے آنکھیں کھول دیں اور مالتی کو کھڑا دیکھ کر دونی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور اس کی گود کے لئے ہاتھ پھیلا دئے۔ مالتی نے اسے گود میں اٹھا لیا اور تھپکیاں دینے لگی۔

بچہ مالتی کی گود میں جا کر جیسے کسی بڑے سکھ کا احساس کرنے لگا اور اپنی جلتی ہوئی انگلیوں سے اس کے گلے کی موتیوں کی مالا پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے

لگا۔ مالتی نے نکلیس اتار کر اس کے گلے میں ڈال دی۔ بچے کی خود غرضانہ فطرت اس حالت میں بھی برقرار تھی۔ نکلیس پاکر اب اسے گود میں رہنے کی کوئی ایسی ضرورت نہ رہی۔ یہاں نکلیس کے چھن جانے کا خوف تھا۔ اس وقت جھنیا کی گود زیادہ محفوظ تھی۔

مالتی نے شگفتہ دلی سے کہا: "بڑا چالاک ہے، چیزے کر کیسا بھاگا!"

جھنیا نے کہا: "دے دو بٹیا، مس صاحب کا ہے۔"

بچے نے مالا کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا اور ماں کی طرف غصے سے دیکھا۔ مالتی بولی: "تم پہنے رہو بچہ، میں مانگتی نہیں ہوں۔"

اسی وقت بنگلے میں آکر اس نے اپنی نشست کا کمرہ خالی کر دیا اور اسی وقت جھنیا اس میں آکر مقیم ہو گئی۔ منگل نے اس بہشت کو تعجب کی نگاہوں سے دیکھا۔ چھت میں پنکھا تھا، رنگین برقی بلب تھے، دیواروں پر تصویریں تھیں۔ ان چیزوں کو دیر تک ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہا۔ مالتی نے بڑے پیار سے پکارا "منگل!"

منگل نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو: "آج تو ہنسا نہیں جاتا۔ مس صاحب! کیا کروں؟ آپ سے کچھ ہو سکے تو کیجئے۔"

مالتی نے جھنیا کو بہت سی باتیں سمجھائیں اور جاتے ہوئے پوچھا۔ "تیرے گھر میں کوئی دوسری عورت ہو تو کو بر سے کہہ دے کہ دو چار روز کے لئے بلا لائے مجھے چیچک کا اندیشہ ہے۔ کتنی دور ہے تیرا گھر؟"

جھنیا نے اپنے گاؤں کا نام اور پتہ بتایا: "اٹھارہ بیس کوس کے قریب ہوگا۔"

مالتی کو بیلاری یاد تھا۔ بولی "وہی گانوں تو نہیں جس کے پچھم طرف آدھے میل پر ندی ہے؟"

"ہاں ہاں صاحب، وہی گانوں ہے، آپ کو کیسے معلوم؟"

ایک بار ہم لوگ وہاں گئے تھے اور ہوری کے گھر ٹھہرے تھے۔ تو اسے جانتی ہے۔"

وہ تو میرے سسر ہیں، مس صاحب۔ میری ساس بھی ملی ہوں گی۔"

ہاں ہاں، بڑی سمجھ دار عورت معلوم ہوتی تھی۔ مجھ سے خوب باتیں کرتی رہی۔ تو گوبر کو بھیج دے، اپنی ماں کو بلا لائے۔"

"وہ انھیں بلانے نہ جائیں گے۔"

"کیوں؟"

"کچھ ایسا ہی کارن ہے۔"

جھنیا کو اپنے گھر کا جوکا برتن، روٹی پانی اور جھاڑنا، بٹورنا وغیرہ سب ہی کچھ کرنا پڑتا تھا۔ دن کو تو دونوں چربن پر رہ جاتے تھے اور رات کو جب مالتی آجاتی تو جھنیا اپنا کھانا پکاتی اور مالتی بچے کے پاس بیٹھتی۔ جھنیا بار بار چاہتی کہ بچے کے پاس بیٹھے مگر مالتی اسے نہ آنے دیتی۔ رات کو بچے کا بخار تیز ہو جاتا اور وہ بے چینی سے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لیتا۔ مالتی اسے گود میں لے کر گھنٹوں کمرے میں ٹہلتی، چوتھے دن چیچک نکل آئی۔ مالتی نے سارے گھر کو ٹیکہ لگایا خود اپنے لگایا اور مہتا کو بھی لگایا۔ گوبر، جھنیا، مہراج کوئی نہ بچا۔ پہلے دن تو دانے چھوٹے اور الگ الگ تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ چھوٹی چیچک ہے۔ دوسرے دن دانے جیسے کھل اٹھے اور انگور کے برابر ہو گئے۔ اور پھر کئی کئی دانے مل کر بڑے بڑے آنولہ سے ہو گئے۔ منگل جلن اور کھجلی اور درد سے بے چین

مالتی کی طرف دیکھتا۔ اس کا کراہنا بھی بڑوں کا سا تھا اور نگاہوں میں بھی سنجیدگی تھی۔ گویا وہ یکایک جوان ہوگیا ہو۔ اس نہ سہنے قابل تکلیف نے گویا اس کے معصوم بچپن کو مٹا ڈالا تھا۔ اس کی طفلانہ عقل گویا وسعت پاکر سمجھ رہی تھی کہ مالتی ہی کے جتن سے وہ اچھا ہو سکتا ہے۔ مالتی جیوں ہی کسی کام سے چلی جاتی تو وہ رونے لگتا اور مالتی کے آتے ہی چپ ہو جاتا۔ رات کو اس کی بے چینی بڑھ جاتی اور مالتی کو عموماً ساری ساری رات بیٹھنا پڑ جاتا۔ مگر وہ نہ کبھی جھنجھلاتی نہ چڑھتی، ہاں جھنیا پر اسے ضرور کبھی کبھی غصہ آتا، کیونکہ وہ اپنی نادانی کے سبب نہ کرنے والا کام بھی کر بیٹھتی۔ گوبر اور جھنیا دونوں کا جھاڑ پھونک پر زیادہ اعتقاد تھا، مگر یہاں کی داشت کرنا نہیں جانتی تھی۔ منگل دق کرتا تو اسے ڈانٹتی، ڈپٹتی ذرا بھی موقع پاتی تو زمین پر سو جاتی اور صبح سے پہلے نہ اٹھتی۔ اور گوبر تو اس کمرے میں جیسے آتے ڈرتا تھا۔ مالتی وہاں بیٹھی ہے، کیسے جائے؟ جھنیا کو بچے کا حال پوچھ لینا اور کھا پی کر سو جانا۔ اس پرانی چوٹ کے بعد وہ پورا تندرست نہ ہونے پایا تھا۔ ذرا سا کام کرکے بھی تھک جاتا تھا۔ ان دنوں جب جھنیا گھاس بیچتی تھی اور وہ آرام سے پڑا رہتا تھا تب کچھ سنبھل گیا تھا، مگر ادھر کئی مہینوں تک بوجھ ڈھونے اور چونے گارے کا کام کرنے سے اس کی حالت پھر گر گئی تھی۔ اس پر یہاں کام بہت تھا۔ سارے باغ کو سینچنا، کیاریوں کو گوڑنا، گھاس چھیلنا۔ گایوں کو چارہ پانی دینا اور دودھنا۔ اور جو مالک اتنا رحم دل ہو اس کے کام میں تساہلی کیسے کرے؟ یہ احسان اُسے ایک منٹ بھی آرام سے نہ بیٹھنے دیتا تھا۔ اور جب مہتا خود کھرپی لے کر گھنٹوں باغ میں کام کرتے تھے تو وہ کیسے آرام کرتا؟ وہ خود سوکھتا جاتا تھا مگر باغ ہرا